

غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی، کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و روح کی گہرائیوں تک اتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود ہی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری اُمت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظام زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آ رہا تھا۔ اسی سے انہوں نے اصول لئے، اسی کے علوم سیکھے، اسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اسی کے نقش قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہل دین کا گردہ بالکل گوشہ خمول میں پھینک دیا گیا۔ اور تمام مسلمان قوموں میں کارفرمائی کی گئیں اور کارکن طاقتیں انہی لوگوں کے ہاتھ میں آ گئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیب جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام آزاد مسلم ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (Secular States) کے نمونے پر بن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت نسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لئے محض ان کا پرستار اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں ان کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوئے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دئے جاتے تھے۔ اسی طرح جو ممالک غلام تھے ان میں بھی تمام تہذیبی اداروں اور سیاسی تحریکوں کے کارفرما اسی قسم کے لوگ بنے، اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد مسلمان قومیں پہنچی ہوئی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو وہ بیچارے مجبور ہیں کہ اسے ٹالیں یا دیباہیں، کیونکہ وہ اُس چیز کی اجمد تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو تعلیم اور ذہنی و عملی تربیت انہوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی روح و مزاج سے اتنی دور

۱۶ اسلامی شریعت کی تفسیح کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی (باقی صفحہ ۱۶۷ پر)

لے جا چکی ہے کہ اس کو سمجھتا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہا ہے۔ اور حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اس وقت تک بیسویں صدی کے لئے بارہویں صدی کے مردانِ کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لئے کوئی ایسا گروہ موجود بھی نہیں ہے جو شاگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی آئین و قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

یہ واقعی ایک سخت پیچیدگی ہے جس نے تمام مسلم ممالک میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس بزرگ عظیم ہند میں کھیلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی ایک مستقل تہذیب، الگ نظریہ زندگی اور مخصوص آئین حیات رکھتے ہیں، ہمارے لئے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے

(بقیہ جلد ۳۱ صفحہ ۱۶۰) تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی، چنانچہ ۱۹۴۷ء تک اس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلتا شروع کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہو گئی اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح و طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقش قدم پر خود وہ ممالک بھی چل پڑے جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لار کو برطانوی ہند کے نمونے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا میں محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۵ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرانس کو ڈھال کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرہ اختیار میں چھوڑ دیے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ٹرکی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ انھوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سویٹزر لینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لئے، بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں بھی وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی غیر مسلم حکومت بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیا میں تعدد ازواج کو قانوناً ممنوع ٹھہرایا گیا۔ اور ٹرکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان (باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

جس کا نظام زندگی نہ محالہ ہمارے آئین حیات سے مختلف ہوگا، ہمیں ایک الگ خطہ زمین دیکھنا ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور ان تھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں وہ خطہ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے، اور اس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان مال اور آبرو دینی پڑی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئین حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لئے اتنے پاؤں بیل کر اور اتنی جاری قیمت ادا کر کے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیرات ہند اور ضابطہ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندوستان کیا بڑا تھا کہ اتنے لڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا۔ اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ ”کار خیر“ بھی ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جاسکتا تھا، اس کے لئے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اتنی جانفشانی اور اتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرنے کی حماقت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آئین اسلامی کے نفاذ کے لئے پابند کر چکے ہیں، ہمارے لئے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہذا چاہے دوسری مسلمان قومیں کچھ کرتی رہیں، ہمیں بہر حال ان ساری پیچیدگیوں کو حل کرنا ہی پڑیگا جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے ان سب کو دور کرنے کی تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لئے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں، اور ان کے عدم اطمینان کی وجہ ان کی عدم واقفیت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول، اس کی روح اور اس کا مزاج کیا ہے، اس میں کیا چیز قطعاً اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۸) اور سعودی عرب و وہی ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ شریعت کی روح وہاں سے بھی غائب ہے۔

کیا ہے، اور اس میں کونسی چیز اہم تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے، اس کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو ان احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر یہ مفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کارفرما اور کارکن دماغ مطمئن ہو جائیں گے اور ان کا اطمینان ان ساری تہذیبوں کا دروازہ کھول دیگا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں۔ میری آج کی تقریر اسی معیار کے لئے ہے۔

قانون اور نظام زندگی کا باہمی تعلق | قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرز عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیے۔ اس سوال کا دائرہ اس دائرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "ہونا چاہیے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ ان کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلے اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقے پر ان جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی شکل اور ان کے ضوابط عمل میں کرتے ہیں، اور قانون ان بہت سے مجموعوں میں سے صرف ان جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لئے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اسلی دائرے پر منحصر کر دے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیے" کے سوال کا جواب دیا ہے، بلکہ اسے سوسائٹی کی اس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش

کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ قانون اسی اسکیم کا ایک جزو ہے، اور اس جزو کے مزاج کو سمجھنا، یا اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ کل کو سمجھا جائے۔

نظام زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں | پھر زندگی کے پورے دائرے میں ہم "کیا ہونا چاہیے" کے سوال کا جو جواب دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے

سوال یعنی "کیوں ہونا چاہیے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "کیا ہونا چاہیے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل ان نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کئے ہیں، اور ان نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اس ماخذ یا ماخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصلی فیصلہ کن اثر ہوتا ہے جہاں سے ہم نے ان نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک ماخذ سے لئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے ماخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس اختلاف کے باعث ان کے نظریے مختلف ہوئے، ان کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں، اور پھر ان سکیموں کے جو حصے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور ان کے ماخذ اور ان سے وجود میں آنے والے پورے نظام حیات کو سمجھ بغیر صرف اس کے قانونی حصہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں اور وہ بھی اس قانونی حصہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اڑتی ہوئی خبریں سن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (Comparative Study) کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظام زندگی کو، جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظام زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے کہ ان کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو مختلف کر دیا ہے۔ لیکن اس

بحث سے گفتگو بہت طویل ہو جائیگی، اس لئے میں صرف اسلامی نظام زندگی کی تشریح پرکتفا کرونگا۔

اسلام جس نظام زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے | اسلامی نظام زندگی کا ماخذ جس کے مختلف ایڈیشن قدیم ترین زمانے سے، توراہ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دنیا میں شایع ہوتے رہے اور آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں الکتاب (The Book) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اس کے ایڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ وہ لوگ ہیں جو مختلف زمانوں میں اس الکتاب کو لیکر آئے اور جنہوں نے اپنے قول اور عمل سے اس کے منشا کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں، لیکن اس بنا پر کہ یہ ایک گروہ کے اشخاص ہیں جو ایک ہی مشن لیکر اٹھے۔ ان سب کو ایک جامع نام المرسلین سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اسلام کا نظریہ زندگی | اس الکتاب اور المرسلین نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ عظیم الشان کائنات جو تمہیں صرّجاً ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقرر قانون پر چلتی ہوئی نظر آ رہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اس کی بے پایان سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہان ہست و بود کا ہر حصہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت (Born Subject) ہو تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے علاقے جی رہے ہو۔ اس لئے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر

کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ حیل سے لیکر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانونِ طبیعی (Laws of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے، اور تمہارے اوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو ان کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو، ایک لحوہ کے لئے بھی تمہارا ان سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو، تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہیے، اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطری حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہیے۔

یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اولین بنیادی حق کا سوال ہے | حق کا بنیادی تصور جو تمام چھوٹے سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز

ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ الکتاب اور الرسول نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امر واقعہ (Fact) کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پا جاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حصے میں بھی اسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصے کا اور اس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لئے بھی حق ہے کہ انسان جن قوتوں اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (delegated) ہیں۔

اس لئے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کئے جاتے ہیں وہ سب خدا کی ملک ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ جس ملک میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ خدا کا ملک ہے۔ اور اس لئے بھی حق ہے کہ عالم کائنات اور حیات انسانی کی ہموازی (Harmony) کا تقاضا ہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصوں کا حاکم اور سرخشاہہ ایک ہی ہو۔ ان دو حصوں کے دو الگ اور ایک دوسرے سے مختلف قبیلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجب فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بڑے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تیزی اور ہوا فساد سے بھر جاتی ہے۔

الکتاب اور الرسول انسان کے سامنے اس حق کو پیش کرتے ہیں اور اس کو دیکھتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اس کو قبول کر لے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اس حصے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے انسان کو خود اختیار دیا ہے اس لئے یہ بتا کر انسان اس حصے میں خدا کو اپنا حاکم مانے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرانی جاتی ہے۔ جس کا اطمینان بھی اس بیان واقعہ (Statement of Fact) پر ہو جائے جو الکتاب اور الرسول نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اس امر کی گواہی دے کہ اس واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری اخذ کی حاکمیت کے لئے تسلیم (Surrender) کر دے۔ اسی تسلیم کا نام اسلام ہے، اور جو لوگ تسلیم کا فیصلہ کریں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیے۔

اب ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا فیصلہ کیا ہو ایک وحدت میں منسلک مسلم سوسائٹی کی حقیقت کئے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے "مسلم" سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم

ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی اُن سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیلات ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے، اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے (Contract) کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا اُن کا حاکم ہے، اسی کی ہدایت اُن کے لئے دستور زندگی ہے، اسی کے احکام ان کے لئے قانون ہیں، وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائیگا اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا، صحیح اور غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لینگے، اور اپنی آزادی کو اُن حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا اُن کے لئے کیمنچ دیگا مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں ”کیا ہونا چاہئے“ کا جواب خود تجویز نہیں کریں گے بلکہ اُس جواب کو قبول کریں گے جو خدا کی طرف سے ملیگا۔

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو الکتاب اور الرسول اُسے ایک ضابطہ زندگی دیتے ہیں جو ”شریعت“ کہلاتا ہے، اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہونا ہوتا ہے کہ اپنے معاملات زندگی کی اُس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ تا وقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی ضبط نہ ہو گئی ہو، وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطہ زندگی اختیار کر سکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس کے ٹوٹتے ہی وہ سوسائٹی ”مسلم“ کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقی طور پر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیز ہے۔ اس سے معاہدہ ٹوٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر یہ طے کر لے کہ شریعت اب اُس کا ضابطہ حیات نہیں ہے، اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کریں گے، یا کسی دوسرے ماخذ سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فسخ معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ ”مسلم“ کا اطلاق درست ہو۔

ان بنیادی امور کی توضیح کے بعد اب ہمیں اس آئیم کو سمجھنے کی شریعت کا مقصد اور اس کے اصول اور روشنی کرنی چاہیے جو انسانی زندگی کے لئے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لئے یہ مناسب ہو گا کہ ہم پہلے اس کے مقصد اور اس کے بڑے بڑے اصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معرفتات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے۔ معرفتات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروف فطرت انسانی سے تاسبت رکھنے والی چیز ہے۔ اور منکرات اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لئے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں۔ انہی چیزوں کو برا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ ان بھلائیوں اور برائیوں کی فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالہ کھینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نکتے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیاد میں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معرفتات اس میں پورے طور پر سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دئے جائیں۔

اس غرض کے لئے وہ معرفتات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور ان موانع کو مٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معرفتات کے قیام اور نشوونما میں کسی طور پر سد نہ ہو سکتے ہوں۔ اس طرح اس معرفتات کے ساتھ ان کے وسائل، تیام و ترقی بھی معروف میں شمار ہو جاتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور، یا نشوونما کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔

یہ دے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام تعلق شعبوں میں اس کا طور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروردان چڑھنے میں مدد ملے، اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو جن جن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض دوسرے مندوب یعنی مطلوبہ تیسرے مباح یعنی جائز۔

فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوسائٹی پر لازم کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف و قطعی احکام دیتی ہے۔

مطلوبہ وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشاد سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو یا جن کے معاملہ میں یہ صاف طور پر اتنا یا زیادہ یا کم ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھہرتا ہے۔ یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے، اور اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین، ضوابط اور طریق کار خود تجویز کرنے کے اختیار حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام، یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی

ناپسندیدہ حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دیدنے گئے ہیں۔ رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طرز پر صراحتہ یا کنایتہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صلح عناصر ان کا سبب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری | معرفت اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا، پہننا اور سنا، نشست، برخاست، بات چیت، نانہانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و ذمہ داریاں، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے، اور پاک و ناپاک کے اقیانانات واضح نہ کر دیے ہوں۔ وہ ہیں ایک صلح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بنا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جن میں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا اور رٹھو رٹھو مٹا دینا ہے، کیا برائیاں ہیں جن کو مٹانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہیے اور عملاً ہمیں کونسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پرمان چرچیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

نظام شریعت کا ناخالص تقسیم ہونا | یہ پورا نقشہ زندگی ایک ہی نقشہ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرت کی ہے جیسی نمود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ جس چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا سالمہ وجود ہے، نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کئے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ انسان یا پل انسان

نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کہچہ بھئی ٹانگ ان خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے، نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائیگی، اور نہ انسانی جسم کے ماتھے، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ کو الگ الگ لے کر آپ ان کے حسن و یا ان کے فائدے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے تناسب اور ان کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک یہی حال شریعت کے نقشہ زندگی کا بھی ہے۔ اسلام اس پورے نقشے کا نام ہے نہ کہ اس کے جدا جدا ٹکڑوں کو۔ اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جدا گانہ رائے زنی زیادہ درست ہو سکتا ہے، نہ مجموعہ سے الگ ہو کر اس کا کوئی جزو وہ کام کر سکتا ہے جو وہ صرف اپنے مجموعہ ہی میں رہ کر کیا کر سکتا ہے۔ دوسرے نظام زندگی میں اس کے کسی جزو یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شائع نے یہ نقشہ اس لئے بنایا ہے کہ یہ پورا کا پورا ایک ساتھ قائم ہوتا رہے، لے لے کہ آپ حسبِ منشاء اس کے جس جزو کو جب چاہیں لیکر قائم کر دیں بغیر اس لئے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس کا ہر جزو دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی وہ کام کر سکتا ہے اور آپ اس کی خوبی کے متعلق صحیح رائے صرف اسی وقت قائم کر سکتے ہیں جبکہ پورے نظام اسلامی کے تناسب اور عمل میں اس کو کام کرتے ہوئے دیکھیں۔

آج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جزو کو نکال لیا جاتا ہے، اور پھر باقی سے موجودہ غیر اسلامی نظام زندگی کے اندر رکھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جزو کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانون فوجداری کی بعض دفعات پر آج کے لوگ بہت ناک بھروسہ چڑھاتے ہیں، لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشہ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر ان کے ساتھ ایک نظام معاشیت ایک نظام معاشرت، ایک نظام حکومت، ایک نظام تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پورے

اجتماعی زندگی میں، کام نہ کر رہا ہو، زہری ان دفعات کو قانون کی کتاب سے کہاں کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اس نقشہ زندگی کے بھی خلاف ہے۔ بلاشبہ سدھی قانون چوبی پر ہاتھ کاٹنے کی منزا دیتا ہے، مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لئے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو جس کا بیت انماں ہر حاجت کی امداد کے لئے ٹھکانا ہو، جس کی ہستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظام معاشرے میں سب لوگوں کے لئے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشرتی نظام میں طبقتوں کی اجارہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور ہائز کسب معاش کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں، جس کے نظام تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو مومن نہیں ہے اگر تیرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لئے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سود کے بغیر نہیں دیتا، جس میں بیت المال کی جگہ بنیک اور انشورنس کمپنی ہے، جس میں حاجت مند کے لئے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دھنکار اور پھنکار ہے، جس کا اخلاقی نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمہ دار ہے، جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقتوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشرتی نظام خند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعے سے ان کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سرا دنیایہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جرم قرار دینا دراصل یہی معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خورد لوگوں کے مال کی حفاظت پیش نظر ہے۔ برعکس اس کے، اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لئے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے

لوگ خود ہی رضا کارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اس کے لئے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور نیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانون تعزیراتِ زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور بشاری شاہ زنا کار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر کیس سوسائٹی میں؟ اُس میں جس کے پورے نظام تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو، جس میں بنی سنوری عورتوں کا منظر عام پر آنا ہو، جس پر نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگی اخلاق کا عام چچا ہو، اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اس گندی سوسائٹی کے لئے نہیں ہے جس میں ہر شرفِ جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں، گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں، جگہ جگہ فلم اسٹاروں کی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں، شہر شہر اور قصبے قصبے سینما درس عشق دے رہے ہیں، انہماک گندالریچر آزادی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے، بنی سنوری خواتین کھٹے بناؤں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظام معاشرت نے اپنے یہودہ رواجوں سے نکاح کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم جان بھادری کا خطاب دینا چاہیے۔

شریعت کا قانونی حصہ | اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصہ کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا ایک جز ہے۔ یہ جزو بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کل سے الگ کر کے اسے بچھا سکے یا جاری کیا جاسکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجراء نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیش نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے اور اس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجراء صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم عملی لحاظ سے کسی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا، کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ بعض اور حصے ایسے ہیں جنہیں اسلام اپنے تزکیہ نفس اور تربیت اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کرنا ہے۔ بعض دوسرے حصے تو ان کو جاری کرنے کے لئے وہ عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصوں کو وہ مسلم سوسائٹی کے صلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کرتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک حصہ بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لئے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظام زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے نشا کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور برائیوں کے استیصال کا انتظام کرے، اور اس کے ان احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لئے ایک نظام عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

یہی آخری حصہ وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے پوری شریعت ہی قانون ہے، کیونکہ وہ رعیت پر حاکم کا مقرر کیا ہوا مجموعہ احکام ہے۔ لیکن چونکہ اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کئے جائیں، اس لئے ہم شریعت کے صرف اس حصہ کو "قانون اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے کے لئے وہ خود اپنے اصول و مفروضات کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔

اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لئے سب سے پہلے ایک دستوری قانون اسلامی قانون کے اہم شعبے (Constitutional Law) کی ضرورت ہے، اور شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دیے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ ان کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کسی کو حقوق شہریت ملنے اور کس بنا پر وہ سلب ہو سکتے ہیں؟ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ ریاست کے قانون اور اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام

کون اصولوں پر چلایا جائیگا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں گے؟ اس کا تقریر کوں کریگا، کس کے سامنے وہ جواب دہ ہوگا، اور کون عدوت کے اندر نہ کام کریگا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس تک عاقل ہوں گے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟ دستوری قانون کے ان تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دے دیا ہے۔ پھر ان اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ دستور کی تفصیلی شکل و صورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنائیں۔ ہم اس امر کے پابند تو ضرور کئے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مقررات کو ہٹائیں ان اصولوں پر قائم نہیں، لیکن کوئی مفصل دستور بنانے کے لئے ہم کو بنا کر نہیں دے دیا گیا ہے جس کے اندر فردعی رد و بدل بھی جائز نہ ہو۔

تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لئے ایک انتظامی قانون

(Administrative Law) کی ضرورت ہے، سو اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دیے ہیں، اور مزید براں اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی مثالی حکومت کے نظائر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لئے کس قسم کے ذرائع اختیار کر سکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کر سکتی؟ حکومت کے وسائل میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لئے حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کوئی بھلائیوں میں جنھیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لئے اسے کوشش کرنی چاہئے اور کوئی برائیاں میں جنھیں روکنا اور دبانانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگان ملک کے معاملات زندگی میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو کون سے اصولی ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص خاص مسائل کے متعلق تلمیح اور تمہیدی حکام بھی دیتی ہے۔ لیکن پورے نظم و نسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر نہیں دیا ہے جسے ایک ہی شکل و صورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھے پر ہم مامور ہوں اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری

قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیلی ضوابط بنانے کی پوری آزادی ہمیں حاصل ہے، البتہ اس آزادی کو ہم ان اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔

اس کے بعد اجتماعی قانون (Public Law) اور شخصی قانون (Private Law) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصولی ہدایات دیتی ہے کہ کسی دور میں اور معاملات زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دئے ہیں وہ ابد تک ہر ملک اور ہر دور کی سوسائٹی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہو سکتے ہیں (شرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی، جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو) اور جو اصولی ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملات زندگی میں تمام ضروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جاسکتے ہیں پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، ان میں خود شریعت ہی کی رو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحاب حل و عقد یا اہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں۔ اور اس طرح جو قوانین بنائے جائیں گے وہ قانون اسلام ہی کا ایک جز شمار ہونگے، کیونکہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے فقہاء نے استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام مدون کئے تھے وہ قانون اسلام ہی کے اجزاء سمجھے گئے۔

سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضرورت پیش آتی ہے۔ اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لئے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں، اور جہاں تفصیلات نہیں ہیں وہاں ایسے اصول و تدبیرے ہیں جن کی روشنی میں تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم

قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے، ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے، اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور کونسی چیز اب تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طریقہ سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔

اس قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سود اور قمار کی حرمت، چوری اور زنا اور قذف کی سزائیں، اور میت کے ترکہ میں وارثوں کے حصے۔

(۲) اصولی احکام جو قرآن اور ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ ہر نشتہ آور چیز حرام ہے، یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضامندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں، یا یہ کہ مرد عورتوں پر توام ہیں۔

(۳) حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادی عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعداد ازواج کے لئے بیک وقت چار عورتوں کی حد، یا طلاق کے لئے تین کی حد، یا وصیت کے لئے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدود اور رعبہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت معین کرتا ہے۔ آپ کسی ایسی تہذیب و تمدن کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابل تغیر و تبدیل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سبھی کچھ قابل ترمیم و تسیح نہ ہوں تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے، وہ تو ایک گھلا ہوا مادہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجے پر

پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پر دیا ہے جہاں انسانی قوت فیصد غلطی کر کے "معروف" سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر، یا صریحاً منع کر کے یا اصول تباکر، یا حد لگا کر گویا نشانات راہ (مسند پوسٹس) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتار ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفر زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا ایک معتد بہ حصہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی، مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے تجربات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو آج معترف بنا دیا ہے اور انہی قوانین کی خوشہ چینی پر وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے قانون ازدواج اور قانون میراث کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔ اس پائدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

(۱) تعبیر یا تاویل احکام، یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور ذمہ داری کا نگاہ رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی گنجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدلائل دوسری تعبیر پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اختلاف تعبیر پہلے بھی امت کے اہل علم میں رہا ہے، آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

(۲) قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملنے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

(۳) اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر ان کو منطبق کرنا جن میں نفاذ بھی نہ ملتا ہوں۔

(۲) استحسان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسب ضرورت ایسے قوانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا ماہن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی سوز افزوں ضروریات اور تغیر حالات کے لئے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اجتہاد و استحسان ہو یا تعبیر و قیاس، بہر حال اس کا مجاز ہر کس فٹ ناکس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی سسٹم پر مفصلہ صادر کرے۔ اس کے لئے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں بنا جا سکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی رائے زنی کا حق صرف انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچانی ہو۔ تعبیر احکام کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دئے گئے ہیں، ان حالات سے واقف ہو جن میں ابتداءً یہ احکام دئے گئے تھے، قرآن کے اندر بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرے پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حس رکھتا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے ان کی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے لئے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور محملات زندگی کا عمدہ فہم — محض عام فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے فہم — درکار ہے۔ استحسان کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اس کے نظام زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو قوانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظام زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ ان علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقاء کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیں ان کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس ہو جو ہو یقیناً یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پروا ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر

نگاہ جاچکے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قد میں پسند کر چکے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں اسلامی قانون کا ارتقا نہیں ہو سکتا، صرف اس میں تھریف ہی ہو سکتی ہے۔

اب میں مختصر طور پر ان اعتراضات سے بحث کروں گا جو پاکستان میں اسلامی اعتراضات اور جوابات | قانون کے اجراء کا مطالبہ سن کر بالعموم کئے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں، اس لئے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی ذرا دل کھول کر کی جاتی ہے۔ لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اسل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور سٹیٹ | تہمت بوسیدگی کی ضروریات کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے ؟

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اڑتی اڑتی خبر سن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اس وقت سے یہ قانون جول کاتوں اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنالے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لئے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دئے گئے تھے ان پر اسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی تھی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقا اول روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدمی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل گیا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں سمنانوں نے قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کی ابتداء تک اس ارتقا کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رکھا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام پہلی دیوثی

اور فوجداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رکا رہا۔ لیکن اول تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم ٹھوڑی سی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا ارتقاء ہوتا ہے، انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحب علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ جس طرح پچھلی ۱۲ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہے گا۔ ناواقف لوگ اس کو جانے بغیر ہزار قسم کے دوسووں میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں، اس کے امکانات سے واقف ہیں، اور اس کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر تنگ دامن کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا اعتراض، جو بلبک میں تو دینی زبان سے مگر سچی صحبتوں میں بڑی کافرانہ جبارتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرون وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنہیں اس مہذب دور کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے، مثلاً ہاتھ کاٹنے اور درے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ منہائیں۔

یہ اعتراض سن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا پاکی دامن کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قب دیکھ

جس دور میں ایٹم بم استعمال کیا گیا ہے، اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہیے۔ آج کا نام نہاد مہذب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثال تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک سے تاریک دور میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار

نہیں بھرا کرتا ہے۔ محض ہاتھ ہی نہیں کاٹنا، جسم کے پرچھے اڑا دیتا ہے۔ دسے برسانے سے اس کا دل نہیں بھرتا، زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مردہ لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صابن بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامہ غیظ و غضب ہی میں نہیں، اس کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو وہ سیاسی مجرم، یا قومی مفاد کا دشمن، یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو دردناک عذاب دینے میں وہ آخر کو نسی کسراٹھا کرتا ہے؟ ثبوت جرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اور اقبال جرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی مہذب حکومتوں میں اختیار کئے جا رہے ہیں وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ صورت انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کر رہے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا ہے وہ دراصل اخلاقی قدروں میں ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں ان پر وہ خوب عذاب دیتے ہیں اور دل کھول کر دیتے ہیں، مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا، یا ان کے معاشی مفاد میں مخرام ہونا۔ لیکن جن افعال کو وہ سرے سے جرم ہی نہیں سمجھتے، مثلاً شراب سے ایک گونہ بخودی حاصل کر لینا، یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو درکنار، سزائش اور ملامت بھی انھیں ناگوار ہوتی ہے۔ اور جرم نہ سمجھنے کی صورت میں لامحالہ ناگوار خاطر ہوتی ہی چاہیے۔

اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قدروں کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی قدریں؟ یا موجودہ ہندیب کی؟ اگر آپ کی قدریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و صواب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کئے تھے اور دوسرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لئے ہیں، تو پھر اسلام کے دائرے میں آپ کی جگہ ہے کہاں کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گفتگو چھیڑیں۔ آپ کا مقام اندر نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بنائیے، کوئی اور نام اپنے لئے تجویز کیجئے، اور صاف صاف یوں کہئے کہ ہم اسلام کو بحیثیت ایک دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں، اس پر ایمان لانے کا آخر کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا ہے،

اور کون جہت یہ باور کر سکتا ہے کہ اس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد آپ اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔
فقہی اختلافات کا بہانہ | تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقے کی فقہ جدا ہے، اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقے کی فقہ کے مطابق ہوگا؟

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اسی سوال پر مسلمانوں میں بھوٹ ڈال کر وہ اسلام کے "خطرے" کو ٹال سکیں گے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائیگا۔ حالانکہ حقیقت یہ سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں، اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ، جو خدا اور رسول کے مقرر کئے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتداء سے آج تک یکساں مسلم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں، تعبیرات احکام میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں، اور دائرۃ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوئے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو، یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو، یا کوئی فتویٰ جو استحسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ دراصل اس کی جنسیت محض ایک تجویز کی ہوتی ہے۔ قانون وہ صرف اسی وقت بنتا ہے جبکہ اس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتویٰ اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہاء جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیہ اجماع یا علیہ الجمہور امہ علیہ الفتویٰ، تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے

کی بنا پر اب یہ قانون بن چکی ہے۔

یہ اجناسی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام امت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے، یا دنیا سے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہے، دوسرے وہ جن پر کسی دین کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انھیں قبول کرے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظر ثانی کے قابل نہیں ہیں، انہیں تمام مسلمانوں کو بحیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں، تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس رائے میں اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں، اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائیں گے۔

یہ حیثیت تو پچھلے فقہی احکام کی ہے۔ رہا آئندہ کا معاملہ، تو آگے پیشہ آنے والے معاملات میں علم نورا اور رسول کی جس تعبیر یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے صحابہ حل و عقد کا اجماع ہو جائیگا، یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کریگی وہ ہمارے ملک کے لئے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی تناوینی پرتل ہوتا تھا جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلم ہوتے تھے، اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابل عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کونسی صورت تجویز کی جاسکتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل التعداد گروہ پرنسپل لاکی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیے، لیکن قانون ملکی (Law of the Land) بہر حال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر معقول بات کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں ہندیاہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیے اسلام میں اختلاف کر کے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی بیہودہ بات ہے جو چند کفر پند افراد کو چاہیے

کتنی ہی پسند ہو، بہر حال کسی فریقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے۔

غیر مسلم بھی آباد ہیں۔ وہ کس طرح یہ گوارا کریں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط ہو جائے؟ یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر محض ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اسی لئے ان کو اس میں بڑی پھپھکی نظر آتی ہے۔ حالانکہ تجویزی سے تھیس کرنے کے بعد اس کی ساری الجھنیں خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہرات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانون ملکی ہے نہ کہ قانون شخصی جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو یہ مسلم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمہ کو دیا تھا، بلکہ حقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دور کے اہل قانون نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے اور یہ اصول معلوم کیا ہے کہ جس ریاست کی آبادی مختلف المذہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت چلنے چاہئیں۔ لہذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مسلط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانون ملکی کو نسا ہو؟ انصاف کی رو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانون ملکی وہی ہونا چاہئے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اس کے مانگنے سے پہنے ہی تسلیم کیے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لئے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ہاتھوں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق

نہیں سمجھتے جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے، ہمیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ اختیارات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ متبدل ہو رہے ہیں۔ کیانی الواقع کسی اقلیت کا ہم پر یقین ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کریں؟ کیا کوئی اقلیت کسی بااختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی معقول اصول ہے کہ جس ملک میں مختلف المذہب لوگ آباد ہوں اس میں سب کو لاء مذہب ہی ہو کر رہنا چاہیے؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے۔

ہماری نئی زیر طبع مطبوعات

- ۱۔ سموو کتاب میں مدیر ترجمان نے سود، بینکنگ، انشورنس وغیرہ کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے اور ان سے متعلقہ معاشی نظریات اور مسائل پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی ہے صفحہ ۲۰۰ صفحہ قیمت ۱۰/-
- ۲۔ الجہاد فی الاسلام۔ یہ کتاب عرصے سے نایاب اور غیر مطبوع تھی اب اسے دوبارہ چھپوایا جا رہا ہے۔
- ۳۔ منہاج الانقلاب الاسلامی۔ یہ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے کا عربی ترجمہ ہے جو مولانا مسعود عالم ندوی نے کیا ہے صفحہ ۲۰۰ صفحہ قیمت ۱۰/-
- ۴۔ الدین القیم۔ یہ عربی ترجمہ ہے جو ترجمہ موصوف نے ہی کیا ہے صفحات ۲۰۰ صفحہ قیمت ۱۰/-
- ۵۔ نظریۃ الاسلام السیاسیہ۔ یہ اسلام کی نظریہ سیاسی کا عربی ترجمہ ہے صفحہ ۲۰۰ صفحہ قیمت ۱۰/-
- ۶۔ تفہیمات۔ بھی دوبارہ طبع ہو چکی ہے۔

مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور

روزہ اور ضبط نفس

(یہ تقریر چار جہاں اسلامی سائنس کونریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی)

روزے کے بے شمار اخلاقی و روحانی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان میں ضبط نفس کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم ضبط نفس کا مطلب سمجھ لیں، پھر معلوم کریں کہ اس کا نام کس قسم کا ضبط نفس چاہتا ہے، اور اس کے بعد یہ دیکھیں کہ روزہ کس طرح یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

ضبط نفس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی خودی جسم اور اس کی طاقتوں پر اچھی طرح قابو پانے ہو اور نفس کی خواہشات و جذبات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اس کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہیں۔ انسان کے وجود میں خودی کا مقام وہی ہے جو ایک سلطنت میں حکمراں کا مقام ہوا کرتا ہے۔ جسم اور اس کے اعضاء خودی کے آلہ کار ہیں۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لئے ہیں۔ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خودی کے حضور اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پر پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ ان آلات اور طاقتوں کو کس مقصد کے لئے کس طرح استعمال کرے اور نفس کی گزارشات میں سے کسے قبول اور کسے رد کرے۔ اگر کوئی خودی اتنی کمزور ہو کہ جسم کی مملکت میں وہ اپنا حکم اپنے منشا کے لئے چلا سکے، اور اس کے لئے نفس کی خواہشیں مطالبات اور احکام کا درجہ رکھتی ہوں۔ مغلوب اور بے بس خودی ہے، اس کی مثال اس سوار کی سی ہے جو اپنے گھوڑے میں اگیا ہو۔ ایسے کمزور انسان دنیا میں کسی قسم کی بھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تاریخی انسانوں میں جن لوگوں نے اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے وجود کی طاقتوں کو بزور اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے، جو خواہشات نفس کے بندے اور جذبات کے غلام بن کر نہیں بلکہ ان کے آقا بن کر رہے ہیں، جن کے ارادے مضبوط اور غم بختہ رہے ہیں۔